جناب وحید الدین خاں صاحب

مذہب کے بغیر کیا

میک گل یونیورسٹی کے پروفیسر مائیکل بریچر (MICHAEL BRECHER) نے پنڈت جواہر لال نہرو کی سیاسی سوانح حیات لکھی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے پنڈت نہرو سے ملاقات بھی کی تھی۔ نئی دہلی کی ایک ملاقات میں ۱۳ جون ۱۹۵۶ء کو انہوں نے پنڈت نہرو سے سوال کیا:-

"آپ مختصر طور پر مجھے بتائیں کہ آپ کے نزدیک اچھے سماج کے لئے کیا چیزیں ضروری ہیں۔ اور آپ کا بنیادی فلسفۂ زندگی کیا ہے۔"

ہندوستان کے سابق وزیر اعظم نے جواب دیا:

"میں کچھ معیاروں کا قائل ہوں۔ آپ ان کو اخلاقی معیار (MORAL STADADS) کہہ لیجئے۔ یہ معیار ہر فرد اور سماجی گروہ کے لئے ضروری ہیں۔ اگر وہ باقی نہ رہیں تو تمام مادی ترقی کے باوجود آپ کسی مفید نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان معیاروں کو کیسے قائم رکھا جائے، یہ مجھے نہیں معلوم۔ ایک تو مذہبی نقطۂ نظر ہے۔ لیکن یہ اپنے تمام رسوم اور طریقوں کے ساتھ مجھے تنگ نظر آتا ہے۔

----- میں اخلاق اور روحانی قدروں کو مذہب سے علیحدہ رکھ کر بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ ان کو یا قدرن زندگی میں کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک مسئلہ ہے۔"

NEHRU: A POLITICAL BIOGRAPHY (LONDON 1958) 607-8

یہ سوال و جواب جدید انسان کے اس دوسرے خلا کو بتاتا ہے جس میں آج وہ شدت سے

گرفتار ہے۔ افراد کو دیانت و اخلاق کے ایک خاص معیار پر باقی رکھنا ہر سماجی گروہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اس کے بغیر تمدن کا نظام صحیح طور پر برقرار نہیں رہ سکتا۔ مگر خدا کو چھوڑنے کے بعد انسان کو نہیں معلوم کہ وہ اس ضرورت کو کیسے پورا کرے، تین سو برس کے تجربے کے بعد وہ ابھی بدستور تلاش کی منزل میں ہے۔ پبلک اور حکام کے درمیان عمدہ تعلقات پیدا کرنے کے لئے خوش اخلاقی کا ہفتہ (COURTESY WEEK) منایا جاتا ہے۔ مگر اس کے بعد بھی جب سرکاری ملازموں کی افسرانہ ذہنیت ختم نہیں ہوتی تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس مقصد کے لئے "اخلاق" کا حوالہ دینا کافی نہیں ہے۔ بے ٹکٹ مسافروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو روکنے کیلئے تمام اسٹیشنوں پر بڑے بڑے پوسٹر لگائے جاتے ہیں۔ "بے ٹکٹ سفر کرنا سماجی گناہ ہے۔" ———— (TICKETLESS TRAVEL IS A SOCIAL EVIL) مگر جب اس کے باوجود بے ٹکٹ سفر ختم نہیں ہوتا، تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ "سماجی گناہ" کا لفظ وہ احساس پیدا نہیں کر سکتا جو نظم و ضبط کی تعمیل کے لئے محرک بن سکے۔ پریس کے ذریعہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ کہ جرم کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ (CRIME DOES NOT PAY) مگر جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار بتاتی ہے۔ کہ دنیوی بدانجامی کے اندیشہ میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ کہ وہ آدمی کو جرم سے باز رکھے۔ تمام دفتروں کی دیواریں مختلف زبانوں کے ان الفاظ سے رنگین کر دی جاتی ہیں۔ "رشوت لینا اور رشوت دینا پاپ ہے" مگر جب ایک شخص دیکھتا ہے۔ کہ ہر محکمے میں عین انہیں الفاظ کے نیچے رشوت کا کاروبار پورے زور شور سے جاری ہے تو وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے سرکاری پروپیگنڈے رشوت کو روکنے میں کسی درجہ میں بھی مفید نہیں ہیں۔ ریل کے تمام ڈبوں میں اس مضمون کے کتبے لگائے جاتے ہیں۔ "ریلوے قوم کی ملکیت ہے۔ اس کا نقصان پوری قوم کا نقصان ہے۔" مگر اس کے باوجود جب لوگ کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالتے ہیں۔ اور بجلی کے بلب غائب کر دیتے ہیں، تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے، کہ "قوم" کے مفاد میں اتنا زور نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ایک شخص اپنے ذاتی مفاد کو قربان کر دے۔

"اجتماعی ذرائع کو ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرنا ملک و قوم سے غداری ہے۔" ایک طرف لیڈروں اور حکمرانوں کی زبان سے یہ اعلان ہو رہا ہے، دوسری طرف بڑے بڑے قومی منصوبے اس لئے ناکام ہو رہے ہیں۔ کہ سرمایہ کا بڑا حصہ اصل منصوبے پر لگنے کی بجائے متعلقہ کارکنوں کی تحویل میں چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ساری قومی زندگی انتہائی کوشش کے باوجود ان معیاروں سے محروم ہو گئی ہے۔ جو قومی تعمیر کے لئے ضروری ہیں۔ اور ان معیاروں کو پیدا کرنے کے لئے ذرائع استعمال

کئے گئے وہ سب کے سب قطعی ناکام ثابت ہوئے ہیں"۔

یہ علامتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ بے خدا تہذیب نے انسانیت کی گاڑی کو دلدل میں لا کر ڈال دیا ہے۔ اس کو اس پٹڑی سے محروم کر دیا ہے جس کے اوپر چل کر وہ اپنا سفر بحسن وخوبی طے کر سکتی ہے۔ زندگی کی کشتی بے لنگر اور بغیر بادبان ہو گئی ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ انسان خدا کی طرف پلٹے، وہ زندگی کے لئے مذہب کی اہمیت تسلیم کرے۔ یہی وہ تنہا بنیاد ہے جس پر زندگی کی بہتر تعمیر ممکن ہے۔ اس کے سوا کسی بھی دوسری بنیاد پر زندگی کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔

ہندوستان میں امریکہ کے سابق سفیر مسٹر چیسٹر باولز (CHESTER BOWLES) لکھتے ہیں:

"زیر ترقی ممالک صنعتی ترقی حاصل کرنے کے سلسلے میں دو طرح کے مسائل سے دوچار ہیں۔ اور اور دونوں نہایت پیچیدہ ہیں۔ ایک یہ کہ سرمایہ، خام اشیاء اور فنی مہارت جو انہیں حاصل ہیں، ان کو کس طرح زیادہ بہتر طور پر استعمال کریں ــــــ دوسرا پیچیدہ مسئلہ وہ ہے جس کا تعلق عوام اور اداروں سے ہے۔ صنعت کو تیزی سے آگے بڑھانے کے ساتھ ہمیں یہ تیقن بھی حاصل کرنا ہے، کہ وہ جتنی خرابیوں کو دور کرے اس سے زیادہ خرابیاں پیدا نہ کر دے۔ مہاتما گاندھی کے الفاظ میں "سائنسی معلومات اور دریافتیں محض حرص کو بڑھانے کا اوزار ثابت ہو سکتی ہیں۔ اصل قابل لحاظ چیز انسان ہے"۔

THE MAKINGS OF A JUST SOCIETY (DELHI 1963 P. 68-69)

باولز کے الفاظ میں "عوام گویا وہ ماحول ہیں جس کے اندر ترقیاتی پروگرام جاری ہوتے ہیں۔ ترقی کے ضروری سامان۔ سرمایہ اور فنی مہارت وغیرہ تمدنی اور سیاسی خلا میں کارگر ثابت نہیں ہو سکتے" صہ ۳۱

یہ خلا کیسے پر ہو، اور وہ ماحول کیسے بنے۔ جس میں عوام اور سرکاری کارکن دیانت داری اور اتحاد کے ساتھ ترقیاتی کاموں میں اپنے آپ کو صرف کریں۔ اس سوال کا کوئی جواب جدید مفکرین کے پاس نہیں ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بے خدا تہذیب کے ماحول میں نہیں ہو سکتا۔ بے خدا تہذیب کے اندر ہر ترقیاتی اسکیم ایک زبردست تضاد کا شکار رہتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس کا شخصی نظریہ اس کے سماجی تصور سے ٹکراتا ہے۔ اس کا اجتماعی پروگرام یہ ہے کہ ایک پرامن اور خوشحال سماج کی تعمیر کی جائے۔ مگر اسی کے ساتھ اس کے مفکرین جب یہ کہتے ہیں کہ "انسان کا مقصد مادی خوشی حاصل کرنا ہے" تو وہ اپنی پہلی بات کی تردید کر دیتے ہیں، وہ پورے سماج کو جیسا دیکھنا چاہتے ہیں سماج کے افراد کو اس کے خلاف بنا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی کسی اسکیم کو اب تک اپنے

مقصد میں حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ تمام مادی فلسفے زندگی کا بہتر نظام بنانے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

مادی خوشی کو زندگی کا مقصد بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی خواہش پوری کرنا چاہے۔ لیکن اس محدود دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص دوسرے کو متاثر کئے بغیر یکساں طور پر اپنی خواہش پوری کر سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک آدمی جب اپنی تمام خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہے، تو وہ دوسروں کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ فرد کی خوشی سماج کی خوشی کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ ایک محدود آمدنی والا شخص جب دیکھتا ہے۔ کہ اس کی اپنی آمدنی اس کی خواہشوں کی تکمیل کے لئے کافی نہیں ہو رہی ہے، تو وہ حق ماری، بد دیانتی، چوری، رشوت اور غبن کے ذریعہ اپنی آمدنی کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ مگر اس طرح جب وہ اپنی خواہش پوری کر لیتا ہے۔ تو وہ سماج کو اسی محتاجی میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں وہ خود پہلے مبتلا تھا۔ جدید دنیا ایک عجیب و غریب قسم کی نہایت خطرناک مصیبت میں مبتلا ہے جس کا تاریخ میں کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، یہ جرم کم سنی (JUVENILE DELINQUENCY) ہے۔ جو جدید زندگی کا لازمہ بن چکا ہے۔ یہ کم سن مجرمین کہاں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی پیدائش کا سرچشمہ وہی مادی خوشی کو پورا کرنا ہے۔ ایک شادی شدہ جوڑا کچھ دنوں ساتھ رہنے کے بعد ایک دوسرے سے اکتا جاتے ہیں۔ اور اپنی جنسی خوشی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ نیا جسم اور نیا چہرہ تلاش کریں۔ اس وقت وہ طلاق لے کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اس علیحدگی کی قیمت سماج کو چند ایسے بچوں کی شکل میں ملتی ہے۔ جو اپنے ماں باپ کی موجودگی میں "یتیم" ہو گئے ہیں۔ یہ بچے والدین سے چھوٹنے کے بعد ماحول کے اندر اپنی کوئی جگہ نہیں پاتے، ایک طرف وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں۔ اور دوسری طرف ماحول سے بیزار، یہ صورت حال بہت جلد انہیں جرائم تک پہنچا دیتی ہے۔ سر الفرڈ ڈیننگ (ALFRED DENING) نے بہت صحیح لکھا ہے۔ کہ اکثر کم سن اور نابالغ مجرمین اجڑے ہوئے گھرانوں (BROKEN HOMES) سے نمودار ہوتے ہیں۔

THE CHANGING LAW P. 111

اسی طرح موجودہ زندگی میں تمام خرابیوں کی جڑ صرف یہ واقعہ ہے۔ کہ جدید دنیا کا انفرادی فلسفہ اور اس کے اجتماعی مقاصد ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ وہ تمام واردات جن کو ہم ناپسند کرتے ہیں۔ اور ان کو جرم، برائی اور بد عنوانی کہتے ہیں۔ وہ دراصل کسی شخص یا پارٹی یا قوم کی اپنی مادی خوشی حاصل کرنے کی کوشش ہی ہوتی ہے۔ اور اسی کوشش کا سماجی انجام قتل۔ بدکاری۔ لڑائی، اغوا،

جعل سازی، ڈاکہ، لوٹ کھسوٹ، جنگ اور اسطرح کی دوسری بے شمار صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ تضاد بتاتا ہے۔ کہ زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی مادی چیزوں کے بجائے آخرت میں خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کو مقصد بنایا جائے۔ یہی وہ مقصد ہے جو فرد اور سماج کو باہمی تضاد سے بچاکر متوافق ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے ...... نظریہ آخرت کی یہ خصوصیت جہاں یہ ثابت کرتی ہے، کہ وہی وہ واحد بنیاد ہے، جو ترقیاتی اسکیموں کو صحیح طور پر کامیاب کرسکتی ہے، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی ثابت کرتی ہے، کہ وہی حقیقی مقصد ہے، کیونکہ غیر حقیقی چیز کسی مقصد کے لئے اتنی اہم اور اس سے اتنی ہم آہنگ نہیں ہوسکتی ہے۔

بیسویں صدی کی بیماری

موجودہ زمانے میں طب اور سرجری میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ یہ خیال کیا جانے لگا ہے۔ کہ سائنس، موت اور بڑھاپے کے سوا ہر جسمانی تکلیف پر قابو پا سکتی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ بیماری کے اقسام میں نہایت تیزی سے ایک نئے نام کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اعصابی بیماری (NERVOUS DSEASES)

یہ "اعصابی بیماریاں" کیا ہیں، یہ دراصل اسی تضاد کا ایک عملی ظہور ہے جس میں جدید سوسائٹی شدت سے مبتلا ہے۔ مادی تہذیب نے انسان کے اس حصے کو جو نمکیات، معدنیات اور گیسوں کا مرکب ہے، ترقی دینے کی کافی کوشش کی۔ مگر انسان کا وہ حصہ جو شعور، خواہش اور ارادہ پر مشتمل ہے، اس کی غذا سے اس کو محروم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلا حصہ تو بظاہر فربہ اور خوش منظر دکھائی دینے لگا۔ مگر دوسرا حصہ جو اصل انسان ہے، وہ طرح طرح کے عوارض میں مبتلا ہو گیا۔

موجودہ امریکہ کے بارے میں وہاں کے ذمہ دار ذرائع کا اندازہ ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں اسی فیصد مریض ایسے ہیں، جن کی علالت بنیادی طور پر نفسیاتی سبب (PSYCHIC CAUSATIO) کے تحت واقع ہوتی ہے۔ ماہرین نفسیات نے اس سلسلے میں جو تحقیقات کی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے، کہ ان بیماریوں کے پیدا ہونے کے چند اہم ترین وجوہ یہ ہیں: جرم، ناراضگی، اندیشہ، پریشانی، مایوسی، تذبذب، شبہ، حسد، خود غرضی، اور اکتاہٹ (BOREDOM) یہ سارے عوارض، اگر گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو بے خدا زندگی کا نتیجہ ہیں۔ خدا پر ایمان آدمی کے اندر وہ اعتماد پیدا کر دیتا ہے۔ جو مشکلات میں اس کے لئے سہارا بن سکے۔ وہ ایسا برتر مقصد اس کے سامنے رکھ دیتا ہے، جس کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے مسائل کو نظر انداز کر کے اس کی طرف بڑھ سکے، وہ اس کو ایسا محرک دیتا ہے، جو سارے اخلاقی محاسن کی واحد بنیاد ہے۔ وہ عقیدے کی

وہ طاقت دیتا ہے جس کے متعلق ڈاکٹر سر ولیم اوسلر (SIR WILLIAMOSLER) نے کہا ہے۔
"وہ ایک عظیم قوت محرکہ (GREAT MOVING FORCE) ہے جس کو نہ کسی ترازو میں تولا جا سکتا ہے، اور نہ لیبارٹری میں اسکی آزمائش کی جا سکتی ہے"

یہی عقیدے کی طاقت دراصل نفسیاتی صحت کا خزانہ ہے۔ جو نفسیات اس سرچشمہ سے محروم ہو وہ "بیماریوں" کے سوا کسی اور انجام سے دوچار نہیں ہو سکتی۔ یہ انسان کی بدقسمتی ہے، کہ وقت کے ماہرین نے نفسیاتی یا اعصابی عوارض کا کھوج لگانے میں تو کمال درجہ کی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ مگر ان نو دریافت بیماریوں کا صحیح علاج تجویز کرنے میں وہ سخت ناکام ہوئے ہیں۔ ایک عیسائی عالم کے الفاظ میں "نفسیاتی علاج کے ماہرین (PSYCHIATRISTS) صرف اس تالے کی باریک تفصیلات بتانے میں اپنی کوشش صرف کر رہے ہیں۔ جو بیمار سے اوپر صحت کے دروازے بند کرنے والا ہے"

جدید معاشرہ بیک وقت دو متضاد عمل کر رہا ہے۔ ایک طرف وہ مادی ساز و سامان فراہم کرنے میں پوری قوت صرف کر رہا ہے۔ دوسری طرف مذہب کو ترک کر کے وہ حالات پیدا کر رہا ہے جس سے زندگی طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہو جائے۔ وہ ایک طرف دوا کھلا رہا ہے۔ اور دوسری جانب زہر کا انجکشن دے رہا ہے۔ یہاں میں ایک امریکی ڈاکٹر PAUL ERNEST ADOLPH کا ایک اقتباس نقل کروں گا، جو اس سلسلے میں ایک دلچسپ شہادت فراہم کرتا ہے:

"جن دنوں میں میڈیکل اسکول میں زیر تعلیم تھا، میں ان تبدیلیوں سے آگاہ ہوا جو زخم ہو جانے کی صورت میں جسم کے اخلاط (BODY TISSUES) میں رونما ہوتی ہیں۔ خوردبین کے ذریعہ نسیجوں کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ نسیجوں پر مختلف موافق اثرات کے واقع ہونے سے زخم کا اطمینان بخش اندمال ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جب تعلیم ختم کر کے میں عملاً ڈاکٹری کے پیشہ میں داخل ہوا تو مجھے اپنے اوپر بڑا اعتماد تھا۔ کہ میں زخم اور اس کے اندمال کے طریقوں کو اس حد تک جانتا ہوں کہ میں یقینی طور پر موافق نتیجہ پیدا کر سکتا ہوں۔ جب کہ میں اس کے مزدوری وسائل مہیا کر کے اس کو استعمال میں لاؤں۔ لیکن جلد ہی میری اس خود اعتمادی کو صدمہ پہنچا، مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اپنی میڈیکل سائنس میں ایک ایسے عنصر کو نظر انداز کر دیا تھا جو سب سے زیادہ اہم ہے ـــــ یعنی خدا

ہسپتال میں جن مریضوں کی نگرانی میرے سپرد کی گئی، ان میں ایک ستر سال کی بوڑھی عورت

تھی جس کا کولہا زخمی ہو گیا تھا۔ ایکسرے تصاویر کے معائنہ سے معلوم ہوا کہ اسکی نسیجیں (TISSUES) بڑی تیزی سے ٹھیک ہو رہی ہیں۔ میں نے اس سرعت کے ساتھ شفایابی پر اس کو مبارکباد پیش کی۔ انچارج سرجن نے مجھے ہدایت کی کہ اس خاتون کو چوبیس گھنٹے میں رخصت کر دیا جائے کیونکہ اب وہ کسی سہارے کے بغیر چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی ہے۔

اتوار کا دن تھا۔ اسکی بیٹی ہفتہ وار ملاقات کے معمول کے مطابق اسے دیکھنے آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ چونکہ اسکی ماں اب صحت یاب ہے، اس لئے وہ کل آکر اسے ہسپتال سے گھر لے جائے۔ لڑکی اس کے جواب میں کچھ نہیں بولی، اور سیدھی اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ اس نے اپنے شوہر سے اس کے بارے میں مشورہ کیا ہے۔ اور یہ طے ہوا ہے کہ وہ اسکو اپنے گھر نہ لے جاسکیں گے۔ اس کے لئے زیادہ بہتر انتظام کی صورت یہ ہے کہ اس کو کسی دار الضعفاء (OLD PEOPLE'S HOME) میں پہنچا دیا جائے۔

چند گھنٹوں کے بعد جب میں اس بڑھیا کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ بڑی تیزی کیساتھ اس پر جسمانی انحطاط طاری ہو رہا ہے۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر ہی وہ مر گئی ——— کولہے کے زخم کی وجہ سے نہیں بلکہ دل کے صدمہ کی وجہ سے۔

NOT OF HER BROKEN HIP BUT OF A BROKEN HEART

ہم نے ہر قسم کی ممکن طبی امداد اسے پہنچائی مگر وہ جانبر نہ ہو سکی۔ اس کے کولہے کی ٹوٹی ہوئی ہڈی تو بالکل درست ہو چکی تھی، مگر اس کے ٹوٹے ہوئے دل کا کوئی علاج نہ تھا۔ وٹامن، معدنیات اور ٹوٹی ہوئی ہڈی کو اپنی جگہ لانے کے لئے سارے ذرائع استعمال کرنے کے باوجود وہ صحت یاب نہیں ہوئی۔ یقینی طور پر اسکی ہڈیاں جڑ چکی تھیں اور وہ ایک مضبوط کولہے کی مالک ہو چکی تھی مگر وہ بچ نہ سکی۔ کیوں۔ اس لئے کہ اسکی صحت کے لئے اہم ترین عنصر جو درکار تھا، وہ وٹامن نہیں تھا، نہ معدنیات تھے، اور نہ ہڈیوں کا جڑنا تھا۔ یہ صرف امنگ (HOPE) تھی۔ اور جب زندگی کی امنگ ختم ہو گئی تو صحت بھی رخصت ہو گئی۔

اس واقعہ نے مجھ پر گہرا اثر کیا۔ کیوں کہ اس کے ساتھ مجھے یہ شدید احساس تھا کہ اس بوڑھی خاتون کے ساتھ ہرگز یہ حادثہ پیش نہ آتا اگر یہ خاتون خدائی امید سے آشنا ہوتی جس پر ایک عیسائی کی حیثیت سے میں اعتقاد رکھتا ہوں۔ [THE EVIDENCE OF GOD]

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے، کہ جدید ترقی یافتہ دنیا کس قسم کے تضاد سے دوچار ہے۔ ایک طرف

وہ سارے علوم کو اس نہج پر ترقی دے رہی ہے جس سے خدا کا وجود حرف غلط ثابت ہو جائے۔ تعلیم و تربیت کے پورے نظام کو اس ڈھنگ سے چلایا جا رہا ہے جس سے خدا اور مذہب کے احساسات دلوں سے رخصت ہو جائیں۔ اس طرح روح، اصل انسان، کو موت کے خطرے میں مبتلا کر کے اس کے جسم ــ مادی وجود ــ کو ترقی دینے کی سعی کی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے، کہ عین اس وقت جبکہ بہترین ماہرین اسکی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے میں کامیابی حاصل کر چکے ہوتے ہیں، عقیدے کی اندرونی طاقت کی محرومی کی وجہ سے اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اور بظاہر جسمانی صحت کے باوجود وہ موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔

یہی وہ تضاد ہے جس نے آج پوری انسانیت کو تباہ کر رکھا ہے۔ خوش پوش جسم حقیقی سکون سے محروم ہیں۔ عالی شان عمارتیں اجڑے ہوئے دلوں کا مسکن ہیں، جگمگاتے ہوئے شہر جرائم اور مصائب کا مرکز ہیں، شاندار حکومتیں اندرونی سازش اور بے اعتمادی کا شکار ہیں، بڑے بڑے منصوبے کردار کی خامی کی وجہ سے ناکام ہو رہے ہیں، غرض مادی ترقیات کے باوجود زندگی بالکل اجڑ گئی ہے، اور یہ سب نتیجہ ہے صرف ایک چیز کا کہ ــــــ انسان نے اپنے خدا کو چھوڑ دیا، اس نے اس سرچشمہ سے اپنے آپ کو محروم کر دیا جو اس کے خالق و مالک نے اس کے لئے مہیا کیا تھا۔

نفسیاتی امراض کی نوعیت جو اوپر بیان کی گئی، وہ اتنی واضح حقیقت ہے کہ خود اس فن کے علماء نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ نفسیات کے مشہور عالم پروفیسر ینگ (C.G. JUNG) نے اپنی زندگی بھر کا تجربہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

> "پچھلے تیس برسوں میں روئے زمین کے تمام متمدن ممالک کے لوگوں نے مجھ سے (اپنے نفسیاتی امراض کے سلسلے میں) مشورہ حاصل کرنے کے لئے رجوع کیا ہے .... میرے مریضوں میں زندگی کے نصف آخر میں پہنچنے والے تمام لوگ ــــ جو کہ ۳۵ سال کے بعد کبھی جا سکتی ہے۔ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کا مسئلہ اپنے آخری تجزیہ میں زندگی کا مذہبی نقطۂ نظر پانے کے سوا کچھ اور ہو۔ یہ کہنا صحیح ہوگا، کہ ان میں سے ہر شخص کی بیماری یہ تھی کہ اس سے وہ چیز کھو دی تھی جو کہ موجودہ مذاہب ہر دور میں اپنے پیروؤں کو دیتے رہے ہیں۔ اور ان مریضوں میں سے کوئی بھی حقیقۃً اس وقت تک شفایاب نہ ہو سکا۔ جب تک اس نے اپنا مذہبی تصور دوبارہ نہیں پا لیا"۔[1]

[1] Quoted by C.A. Coulson, Science and Christian Belief. P. 110

یہ الفاظ اگرچہ سمجھنے والے کیلئے بجائے خود بالکل واضح ہیں۔ تاہم اگر میں نیویارک اکیڈمی آف سائنس کے صدر اے۔ کریسی مارلیسن کے الفاظ نقل کر دوں تو بات بالکل مکمل ہو جائے گی۔

"ادب واحترام، فیاضی، کردار کی بلندی، اخلاق، اعلیٰ خیالات اور وہ سب کچھ جس کو خدائی صفات (DIVINE ATTRIBUTES) کہا جا سکتا ہے۔ وہ کبھی الحاد سے پیدا نہیں ہو سکتی جو کہ دراصل خودبینی کی عجیب وغریب قسم ہے۔ جس میں آدمی خود اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھا لیتا ہے۔ عقیدے اور یقین کے بغیر تہذیب تباہ ہو جائے گی۔ نظم، بے نظمی میں تبدیل ہو جائے گا۔ ضبطِ نفس اور اپنے آپ پر کنٹرول کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور برائی ہر طرف پھیل جائے گی۔ ضرورت ہے۔ کہ ہم خدا پر اپنے یقین کو دوبارہ مضبوط کریں۔"

(بشکریہ الفرقان)

***.* (MAN DOES NOT STAND ALONE)
P. 123

بقیہ، معراج رسول ﷺ — کہ ان مکانات کو دکھانے کی وجہ سے معراج کرایا گیا۔ اور دیدار کا مطلب یا معنی ہے اللہ کی ذات اقدس کی تجلی کو دل کی آنکھ سے دیکھنا۔ اب سوال یہ باقی رہا کہ معراج کی آسمانوں پر ضرورت کیوں ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ عالم بالا اقدس ہے۔ اور عالم زمین میں گناہ، ظلم، رشوتیں وغیرہ چلتی ہیں۔ جیل خانے مجرموں کے یہاں ہیں۔ مگر عالم بالا اس قسم کی تمام چیزوں سے پاک ہے، سب نیکی ہی نیکی ہے۔ ⁂

—— بقیہ، دعوات عبدیت بحق ——
نے تعجب کی وجہ پوچھی حضرت بلخیؒ نے کہا کہ تم ناتوان اور کمزور ہو فرمایا کہ نہیں مجھے شوق ہے اور محبت کسی کو کمزور نہیں ہونے دیتی اور اگر میں کمزور بھی ہوں تو وہ طاقت کا مالک ہے —— دین کی تعلیم اور تبلیغ کیلئے ایسی ہمت کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔ وآخر دعوانا الحمد للہ رب العٰلمین —— Oooooooooo

ادارۂ الحق حسب ذیل حضرات کا تہ دل سے ممنون ہے، جنہوں نے پچھلے ماہ اپنے حلقہ رسوخ میں سے نئے خریدار مہیا فرما کر اس دینی تبلیغ کے فروغ واشاعت میں حصہ لیا۔ جزاھم اللہ عنا وعن جمیع المسلمین۔
حضرت مولانا قاضی عزیز الرحمان صدر محکمۂ قضا سوات۔ (۳۰ خریدار) جناب صاحبزادہ نور الٰہی صاحب جلہاری شریف جہلم (۱۲ خریدار) جناب نعمت گل خٹک ایگزیکٹو انجینئر کوہاٹ۔ (۹ خریدار) حاجی بشیر الدین صاحب بوگرہ مشرقی پاکستان (۶ خریدار) ایک اہل خیر (۵ خریدار) مولانا قاضی عبد الصمد سرباز ی قلات (۲ خریدار) حاجی وجیہ الدین صاحب مل (۳ خریدار)۔
مولانا قاضی عبد الکریم صاحب۔ کلاچی (۲ خریدار) مولانا محمد سلیمان مدرسہ رحمانیہ۔ میسور۔ انڈیا (۲ خریدار) ——